مجھے اردو سے محبت کیسے ہوئی؟

ڈاکٹر حسیب احمد

ہمارے پیرومرشد (غیر روایتی) جناب خرم مرادؒ نے اپنی آخری علالت کے دوران، بستر پر لیٹے لیٹے اپنی سوانحِ حیات کیسٹ میں ریکارڈ کروائی۔ محقق، ادیب اور مرتب جناب سلیم منصور خالد نے اسے بڑی محبت اور محنت سے ''لمحات'' کے نام سے کتابی شکل میں مرتب کیا اور منشورات نے اسے شائع کیا۔ انہوں نے اس آپ بیتی میں ایک جگہ لکھا ہے کہ بچپن کے جذباتی فیصلے عقلی فیصلوں کی نسبت زیادہ دیرپا اور مضبوط ہوتے ہیں۔ میری اردو سے محبت کے بارے میں یہ بات سو فیصد درست ہے اور اس کا قصہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ والد صاحب بنوں میں ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ بنوں میں اُن کے ایک دوست گُل نصیب صاحب تھے، ان کی گُل نیوز ایجنسی کے نام سے ریگل سنیما روڈ پر دکان تھی، وہ وہاں کئی اخبارات و رسائل کے ایجنٹ تھے۔ وہ ایک پُرانے اسکوٹر پر، جسے وہ عموماً دھکے سے اسٹارٹ کرتے تھے، ''جَنگا جَنگا'' (جنگ اخبار) کی آواز لگا کر اخبارات فروخت کرنے نکلا کرتے تھے۔ وہ چونکہ اَن پڑھ تھے اس لیے ان کی طرف سے خط و کتابت ہمارے ابا جی ہی کیا کرتے تھے۔ گل نصیب صاحب کہتے تھے کہ (عدم ادائیگی کی وجہ سے) جو اخبارات و رسائل بند ہو جاتے، ابّا جی کے خط لکھنے پر ان کی ترسیل فوراً بحال ہو جاتی۔ یہ بات تو جملہ معترضہ کے طور پر آ گئی، گُل نصیب صاحب (اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں ان کے اور ان کے اہل خانہ کے درجات بلند فرمائے، آمین) اور ابّا جی کی دوستی کی وجہ سے کئی رسالے مثلاً کھلونا، بچوں کا ڈائجسٹ، تعلیم و تربیت، سیارہ ڈائجسٹ، اردو ڈائجسٹ وغیرہ گھر میں آیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں یعنی ساٹھ کی دہائی کے آخر میں فیروز سنز کے رسالے ''تعلیم و تربیت'' میں ایک پٹی مستقلاً شائع ہوا کرتی تھی:

> اردو بولیے، اردو لکھیے، اردو پڑھیے۔ یہ ہماری قومی زبان ہے۔

میرے دل میں اردو سے محبت کی بنیاد غالباً اسی پٹی نے ڈال دی تھی۔

میرا ذہن بچپن سے (یا بچپن میں) کافی اچھا تھا۔ یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے لیکن میں نے دوسری یا تیسری جماعت سے اردو ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنے شروع کر دیے تھے۔ حافظہ اور اردو اتنی اچھی تھی کہ پورے پورے اسباق زبانی یاد ہو جاتے تھے۔ اُستانی آہستہ رفتار سے اِملا کرا رہی ہوتی تھیں اور میں اُس سے کافی آگے لکھ چکا ہوتا تھا۔ میں پہلی جماعت میں تھا، استانی نے نظم "جھنڈا ہمارا اونچا رہے گا، جھنڈا ہمارا قومی نشاں ہے، قربان اس پر دل اور جاں ہے" کا املا کرایا تو میں نے کسی غلطی کے بغیر پوری کی پوری نظم درست لکھ دی۔ لیکن اُن صاحبہ نے یہ کہہ کر " کلی کا ننھا سا دل خون کر دیا غم سے" کہ تم نے نقل کی ہے، میں اس پر دستخط نہیں کروں گی، حالانکہ وہ مجھے یہ نظم دوبارہ لکھنے کے لیے بھی کہہ سکتی تھیں۔ خیر یہ تو میں اپنے منہ میاں مٹھو بن رہا تھا۔ اردو ڈائجسٹ میں جنگِ عظیم کی کہانیاں بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔ دنیا کا دستور ہے کہ ہمیشہ فاتح کی تعریف کیا کرتی ہے، اردو ڈائجسٹ بھی اس سے مبّرا نہ تھا۔ جنگ ہائے عظیم کی ان

داستانوں میں اتحادیوں اور یہودیوں کو اکثر معصوم و مظلوم اور جرمنوں اور نازیوں کو ظالم کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں مجھے یہ سمجھ نہ تھی کہ اتحادی کون ہیں اور نازی کون؟ بچپن اور لڑکپن میں میرا ذہن اس لحاظ سے منفی رجحان کا حامل تھا کہ کہانی میں میری ہمدردیاں مجرم یا ہارنے والے کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ان کہانیوں کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ ان گروہوں کو نہ جاننے کے باوجود مجھے جرمن اور نازی اچھے لگنے لگے، اتحادی اور یہودی وغیرہ بُرے لگنے لگے۔ چھٹی جماعت تک آتے آتے جب تاریخ برِعظیم پاک و ہند سے واقفیت ہوتی گئی اور انگریزوں کے مسلمانانِ برعظیم پر "احسانات" کا علم ہوتا گیا تو انگریزوں سے وہ غیر شعوری نفرت، شعوری نفرت کی شکل اختیار کر گئی۔ اس نفرت نے انگریزوں کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے "بغضِ معاویہ" میں اردو سے اتنی محبت ہوگئی کہ کلی طور پر اردو ہندسے لکھنے لگا۔ کسی سے مشورہ کیے بغیر میں نے انگریزی سے لاتعلقی اختیار کر لی۔ جماعت نہم میں تھا تو میرے بہترین استادوں میں سے ایک جناب میر نیاز صاحب (سابقہ صدر مدرس جو اردو کے نفاذ کے کٹر حامی ہونے کے باوجود تحریک نفاذ اردو کی بنوں شاخ میں کوئی عہدہ و ذمہ داری اٹھانے سے انکاری ہیں، اللہ ان کے انکار کو اقرار میں بدل دے اور ہمیں ان کی صلاحیتوں سے استفادہ عطا فرمائے) ہمارے انگریزی کے استاد تھے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ طلباء اردو/اسلامیات/عربی لکھتے ہوئے بھی انگریزی کے ہندسے لکھتے ہیں۔ اسی کلیے کے تحت انگریزی لکھتے ہوئے میں اردو ہندسے کیوں نہ لکھوں؟ ایک بار اس خیال پر عمل کر بیٹھا اور انگریزی کے کسی کام میں نمبر شمار میں اردو ہندسے لکھ ڈالے۔ کام چیک کرتے ہوئے میر نیاز صاحب جو کہ اصولی انسان ہیں، کی نظر اردو ہندسوں پر پڑی تو انہوں نے ان اردو ہندسوں پر خطِ تنسیخ پھیر دیا۔ ایک بار عربی کے استاد کی توجہ اس طرف دلائی کہ لڑکے عربی میں انگریزی ہندسے استعمال کرتے ہیں جس پر انہوں نے لڑکوں کو اردو ہندسے لکھنے کا کہا۔

وقت کے ساتھ اردو سے محبت اور انگریزی سے نفرت زیادہ ہوتی گئی۔ جرمنوں سے بھی محبت بڑھتی گئی اور ایک وقت میں (نہم اور دہم جماعت سے) ہٹلر میری پسندیدہ شخصیت بن گیا۔ جرمنی سے محبت اتنی بڑھی کہ میں مغربی جرمنی کے سفارت خانے کا ماہنامہ ''معلوماتِ جرمنی'' کا باقاعدہ قاری اور ریڈیو ''ڈوچے ویلے'' کولون وائس آف جرمنی کی اردو نشریات کا باقاعدہ سامع بن گیا، اور حتی المقدور جرمن مصنوعات استعمال کرنے لگا۔ میری تقریباً ہر کاپی پر سواستیکا بنا ہوا ہوتا تھا، بلکہ سواستیکا بنانے میں اتنی مہارت ہوگئی تھی کہ میں اچھی خاصی جاذبِ نظر سواستیکا بنا لیا کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک خوبصورت سواستیکا فریم کر کے اپنی بیٹھک میں سجائی ہوئی تھی۔ ایک بار والد صاحب مرحوم سے جنگِ عظیم دوم سے متعلق بات ہو رہی تھی، میں نے ان سے پوچھا کہ اس جنگ میں آپ کی ہمدردیاں کس کے ساتھ تھیں، جرمنوں کے ساتھ یا انگریزوں کے ساتھ؟ ابّا جی نے جواب دیا کہ انگریزوں کے ساتھ! مجھ گستاخ نے فوراً کہا کہ پھر تو آپ بہت اچھے غلام تھے۔

بہر حال بچپن کے اس جذباتی فیصلے نے جہاں مجھے اردو سے قریب کر دیا وہیں مجھے اس کا نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ دراصل یہ بات میں کسی کو بتائی نہیں تھی، نہ ہی کسی سے اس حوالے میں مشورہ کیا تھا۔ انگریزی کو قصداً نظر انداز کرنے سے انگریزی کمزور ہوتی چلی گئی۔ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ انگریزی کو نظر انداز کرنے

سے میں اگلی جماعتوں میں کیسے پہنچتا رہا اور پھر ڈاکٹر کیسے بن گیا، حالانکہ ایم بی بی ایس کا پورا نصاب انگریزی میں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم تھا کہ بچپن میں بہت ذہین تھا (اگرچہ اپنی ہی حرکات کی وجہ سے میں اس ذہانت کو زیادہ بہتر انداز میں استعمال نہیں کر سکا بلکہ اُسے زوال پذیر کر دیا) کمرہ جماعت میں پڑھا ہوا سبق کافی ہو جاتا تھا۔ سوائے حساب کے، (وہ بھی ایک استانی صاحبہ کی ''مہربانی'' سے) بلکہ عملی طور پر اُن دِنوں میرا نظریہ یہ تھا کہ اسکول پڑھائی کے لیے ہے اور گھر پڑھائی کے علاوہ دوسرے کاموں کے لیے۔ علم طِب (Medicine) کی انگریزی کوئی مشکل انگریزی نہیں تھی اور یہ بآسانی سمجھی اور لکھی جا سکتی تھی۔

یہ مضمون شروع تو کسی اور خیال سے کیا تھا لیکن یہاں تک پہنچتے پہنچتے ایک بات شدّت سے ذہن میں کھٹکنے لگی۔ میرا بڑا بارہ سالہ بیٹا اور منجھلا آٹھ سالہ بیٹا پڑھائی میں بالکل دلچسپی نہیں لیتے۔ منجھلے والے کو تو اسکول اور ٹیوشن لے کر جانا انتہائی مشکل کام ہے۔ اگر یہ مکافاتِ عمل ہے یا جیسا کرو گے ویسا بھرو گے والا معاملہ ہے تو پھر یہ مع (کسی پٹھان کے) سود کے مجھے واپس ہوا ہے۔ بچپن میں، میں بھی گھر پر پڑھنے میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ مجھے ابّا جی مشکل ہی سے پڑھنے بٹھا پاتے تھے لیکن بہرحال اسکول میں پڑھا کرتا تھا اور عموماً کوئی پوزیشن بھی لے لیتا تھا۔ البتہ عملی نظریہ یہ تھا کہ اسکول پڑھنے کے لیے ہوتا ہے اور بعد کا وقت غیر نصابی سرگرمیوں (کھیل کود، مطالعہ، گپ شپ) کے لیے۔ بچپن میں پائلٹ بننے کی خواہش تو بہت سے بچے کرتے ہیں لیکن اس خواہش کے ساتھ ساتھ میری ایک ''نیک تمنا'' اور بھی تھی۔ اسکول اتنا بُرا لگا کرتا تھا کہ میں کہا کرتا تھا کہ بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور اپنے اسکول پر بم گراؤں گا۔ اسکول میں جو گھر کا کام (ہوم ورک) ملا کرتا تھا اس کے لیے کوشش کرتا تھا کہ صبح استاد کے کمرۂ جماعت میں آنے سے پہلے ہی وہ کام کر لوں۔ کام مکمل نہ ہو سکے تو گھر پر ہوم ورک میں وقت "ضائع" کرنے کے بجائے مولا بخش سے "تواضع" کروالینا میرے لیے زیادہ قابل ترجیح تھا۔ گرمی کی چھٹیوں کا کام سوائے ڈرائنگ کے، کبھی مکمل نہیں کیا۔ نویں جماعت تک یہ حالت تھی کہ گھر والوں کے دباؤ کی وجہ سے یعنی بہ امرِ مجبوری اسکول جاتا تھا۔ البتہ دسویں جماعت کے آخری چند ماہ گھر میں پڑھائی کر لی تھی، نتیجتاً غیر متوقع طور پر خدائے ذوالجلال والاکرام کے فضل سے بہت اچھے نمبروں سے اسکول میں پہلی پوزیشن حاصل کر لی۔ اگر مجھے مستقلاً پڑھائی کی عادت ہوتی تو شاید میں اپنے شعبے میں کافی آگے بڑھ جاتا اور اس طرح معاشرے کی زیادہ بہتر خدمت کر سکتا۔

ایک اور چیز جس نے مجھے اسکول میں اور نتیجتاً اسکول کے بعد بھی نقصان پہنچایا، میرا اگلی بنچوں پر بیٹھنا تھا۔ پچھلی بنچیں استاد کے ''دائرۂ اثر'' سے دور ہوتی ہیں اور پھر میرے ہم نشست اور میرے اردگرد گاؤں کے رہنے والے ایسے لڑکے تھے جنہیں پڑھائی سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا اور نہ ہی وہ پڑھائی میں اچھے تھے۔ ان کی غیر نصابی سرگرمیاں بھی اچھی نہیں تھیں۔ اُن کا اثر ظاہر ہے کہ مجھ پر بھی پڑا۔ پچھلی بنچوں کے اِن مضر اثرات سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر کچھ دن (ایک ہفتے یا زیادہ سے زیادہ دو ہفتوں) کے بعد آگے کے طلبا کو پیچھے اور پیچھے کے طلبا کو آگے کیا جاتا رہے۔ ہمارے اچھے استاد جناب میر نیاز صاحب نے ایک بار یہ کام شروع کیا تھا لیکن بعد میں وہ اس پر توجہ مرکوز نہ رکھ سکے (کراچی میں عثمان پبلک اسکول کی طالبات والی شاخ میں نشستوں کو روزانہ ایک ایک

درجہ آگے/ پیچھے حرکت دی جاتی ہے)۔

کراچی میں تقریبات اور پروگرامات میں ڈاکٹر مبین اختر صاحب سے ملاقاتیں اور باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ہماری مشترکہ دلچسپی کا موضوع اردو بطور تعلیمی و سرکاری زبان ہوتا تھا۔ اللہ کی توفیق سے ڈاکٹر صاحب نے فروری ۲۰۰۵ء میں اردو کے نفاذ کے لیے ایک تنظیم کی بنیاد رکھ دی۔ ایک اجلاس میں میرا پیش کردہ نام ''تحریکِ نفاذِ اردو'' متفقہ طور پر منظور ہو گیا۔ بعد میں چوہدری احمد خان مرحوم کی کتاب ''اردو سرکاری زبان'' نظر سے گزاری۔ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ انہوں نے نفاذِ اردو کے لیے کتنی کوششیں کیں۔ مرحوم اپنی ذات میں ایک تنظیم تھے۔ انہوں نے بھی اپنی تنظیم کا نام ''تحریکِ نفاذِ اردو'' رکھا تھا جو نادانستگی میں ہم نے بھی رکھ لیا۔ افسوس کہ ان کی زندگی میں مجھے ان کے متعلق کچھ پتہ نہ چلا ورنہ میں ان کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہو جاتا۔ اصل میں یہ باتیں یا تو سینہ بہ سینہ (ذاتی روابط سے) پھیلتی ہیں یا ذرائع ابلاغ یعنی میڈیا کے ذریعے، اور میڈیا کے پاس ''زیادہ اہم کام اور دوسری خبریں'' بھی ہوتی ہیں جن کی اہمیت (کم از کم میڈیا والوں کے لیے) نفاذِ اردو سے زیادہ ہے۔ چوہدری صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ اپنی تحریک کے سلسلے میں کراچی بھی آتے رہتے تھے، لیکن جن لوگوں سے وہ ملتے تھے انہیں اردو کے نفاذ سے زیادہ اپنی تنخواہوں سے دلچسپی تھی۔

یہ ہے میری اردو سے محبت کی کہانی، جس میں کئی اسباق پوشیدہ ہیں، مثلاً انسان کو کبھی یک رُخا نہیں ہونا چاہیے۔ وقت انسان کی سب سے بڑی دولت ہے۔ وقت کو کبھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ وقت کسی پر رحم نہیں کرتا، یہ نہ بچے کو دیکھتا ہے اور ہی کسی جوان، ادھیڑ عمر یا بوڑھے کا لحاظ کرتا ہے۔ یہ ہر اُس شخص کو ضائع کر دیتا ہے جو اسے ضائع کرے، لیکن یہ ہمارے ربِ ذوالجلال والاکرام کا ہم پر انتہائی کرم ہے کہ اس نے آخرت کے سلسلے میں اس قانون کو دنیا کی طرح لاگو نہیں کیا۔ اگر ہم نے ساری عمر بھی اللہ کی نافرمانی اور مخالفت میں گزاری ہو تو بھی وہ ہماری توبہ کا آخری سانس تک انتظار کرتا ہے اور اگر ہم موت سے لمحہ بھر پہلے بھی سچی توبہ کر لیں تو نہ صرف یہ کہ ہمارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے بلکہ ہمارے نامۂ اعمال کی برائیوں کو اچھائیوں سے بدل دیتا ہے۔ (سورۂ فرقان، آیت ۷۰)

☆☆☆